ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 0201

Program: Matric

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ ـــ شعبہ اسلامی فکر، تاریخ وثقافت

کورس: اسلامیات(201)

سٹڈی مبٹرک

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر1 (یونٹ: 1تا3)

کل نمبر: 100 ـــ کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ ـــ مطالعہ وحوالے کے لیے

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ وراہنمائی کے لیے ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ سوالات کو سمجھ کر جوابات اپنے الفاظ میں لکھیں؛ ہو بہو نقل کرنے سے گریز کریں۔ قرآنی آیات واحادیث کے مضامین اس گائیڈ میں مفہوم کی صورت میں حوالے کے ساتھ دیے گئے ہیں ـــ اصل متن کے لیے مستند قرآن مجید وکتبِ حدیث سے رجوع کریں، اور عملی فقہی مسائل میں مستند علماء سے راہنمائی لیں۔

سوال نمبر1: لفظ"عقیدہ" کی لغوی واصطلاحی تعریف کریں اور انسانی اخلاق کی درستی میں صحیح عقیدے کی اہمیت واضح کریں۔(نمبر: 20)

تمہید

انسان کی زندگی میں سب سے بنیادی چیز اس کے عقائد ہیں۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے، جس چیز کو حق اور باطل سمجھتا ہے اور جس مقصد کو اپنی زندگی کا مرکز بناتا ہے، اسی کا عکس اس کے اخلاق، اس کے معاملات اور اس کے روزمرہ رویّوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے سب سے پہلے انسان کے عقیدے کی اصلاح پر توجہ دی ہے، کیونکہ جب جڑ درست ہو جاتی ہے تو تنا، شاخیں اور پھل خود بخود درست ہونے لگتے ہیں۔ اس جواب میں پہلے لفظ "عقیدہ" کی لغوی اور اصطلاحی تعریف بیان کی جائے گی، پھر یہ واضح کیا جائے گا کہ صحیح عقیدہ انسانی اخلاق کی درستی میں کس قدر اہم کردار ادا کرتا ہے اور غلط یا کمزور عقیدہ اخلاقی بگاڑ کا سبب کیوں بنتا ہے۔

عقیدے کی لغوی تعریف

لفظ "عقیدہ" عربی زبان کے لفظ "عَقْد" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گرہ لگانا، مضبوطی سے باندھنا اور کسی چیز کو پختہ طور پر باندھ لینا۔ جب کسی بات کو دل میں اس طرح پختہ کر لیا جائے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے اور وہ انسان کے دل میں گرہ کی طرح مضبوط ہو جائے تو اسے عقیدہ کہا جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے عقیدہ ہر اس پختہ یقین کو کہتے ہیں جسے انسان دل سے مان لے، چاہے وہ بات درست ہو یا غلط؛ چنانچہ اچھے عقیدے کو "عقیدۂ صحیحہ" اور باطل خیالات پر مبنی یقین کو "عقیدۂ فاسدہ" کہا جاتا ہے۔ اس لغوی مفہوم سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عقیدہ محض زبانی اقرار کا نام نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا وہ یقین ہے جو انسان کی سوچ اور عمل دونوں کو متاثر کرتا ہے۔

عقیدے کی اصطلاحی تعریف

شریعت کی اصطلاح میں عقیدہ ان بنیادی حقائق کے پختہ یقین کا نام ہے جن کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے دی ہے اور جن پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان، اس کے فرشتوں پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان اور تقدیر کے بھلے اور برے کے اللہ کی طرف سے ہونے پر ایمان شامل ہے۔ علماء نے عقیدے کی تعریف یوں بھی کی ہے کہ یہ دل کی وہ تصدیق ہے جس کے ساتھ قبول و تسلیم اور عمل کی آمادگی پائی

جائے۔ گویا اصطلاحی عقیدہ تین چیزوں کا مجموعہ ہے: دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کی کوشش۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدے کو دین کی بنیاد اور جڑ قرار دیا گیا ہے، اور باقی تمام احکام و اخلاق اسی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔

عقیدہ اور اخلاق کا باہمی تعلق

عقیدے اور اخلاق کا تعلق جڑ اور درخت، یا بنیاد اور عمارت جیسا ہے۔ اسلامی اخلاق دراصل اس کے اندرونی یقین کا ظاہری اظہار ہوتا ہے۔ جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کا ایک خالق و مالک ہے، وہ ہر وقت اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر بات سنی جا رہی ہے اور ایک دن اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اس شخص کے لیے جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، کسی کا حق مارنا یا ظلم کرنا آسان نہیں رہتا، کیونکہ اس کا عقیدہ اسے ہر لمحہ روک ٹوک کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص کا عقیدہ کمزور ہو یا وہ آخرت کے حساب کتاب کو بھولا ہوا ہو، اس کے سامنے اخلاقی پابندیوں کی کوئی مضبوط بنیاد باقی نہیں رہتی؛ وہ موقع ملتے ہی ذاتی فائدے کے لیے غلط راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اخلاق کی پائیدار درستی کا سب سے مؤثر ذریعہ عقیدے کی درستی ہے، کیونکہ قانون اور پولیس انسان کو صرف ظاہری نگرانی میں روک سکتے ہیں، جبکہ عقیدہ تنہائی میں بھی اس کا نگہبان بنتا ہے۔

صحیح عقیدے کی اہمیت: اہم نکات

1۔ اللہ کی نگرانی کا احساس (احسان و تقویٰ کی بنیاد)

صحیح عقیدہ انسان کے دل میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور انسان کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس مفہوم کی تلقین کی گئی ہے کہ اللہ انسان کے دل کے وسوسوں تک کو جانتا ہے اور وہ انسان کے اس سے زیادہ قریب ہے جتنا وہ خود اپنے سے قریب سمجھتا ہے (ملاحظہ ہو: سورۃ ق، آیت 16 کا مفہوم)۔ اس یقین کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان تنہائی میں بھی گناہ اور بداخلاقی سے بچتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظروں سے چھپنا ممکن ہے مگر اللہ کی نظر سے چھپنا ممکن نہیں۔ یہی احساس سچائی، امانت داری اور پرہیز گاری جیسے اخلاقی اوصاف کی اصل جڑ ہے۔

2۔ آخرت کے حساب کا یقین اور ذمہ داری کا شعور

صحیح عقیدے کا دوسرا بڑا اخلاقی ثمرہ آخرت پر ایمان ہے۔ جب انسان کو یقین ہو کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں ہر چھوٹے بڑے عمل کا حساب ہو گا اور انصاف کے ساتھ جزا و سزا ملے گی، تو وہ دنیا کی عارضی زندگی میں بھی ذمہ داری سے کام لیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس مفہوم پر بار بار توجہ دلائی گئی ہے کہ جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھ لے گا (سورۃ الزلزال، آیات 7 تا 8 کا مفہوم)۔ یہ یقین انسان کو دوسروں کے حقوق ادا کرنے، وعدے پورے کرنے اور کمزوروں پر ظلم سے باز رہنے کی ترغیب دیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیوی عدالت سے بچ نکلنا ممکن ہے لیکن آخرت کی عدالت سے بچنا ممکن نہیں۔

3۔ زندگی کا مقصد واضح ہونا اور اخلاقی استقامت

عقیدہ انسان کو زندگی کا واضح مقصد عطا کرتا ہے۔ جب انسان کو معلوم ہو کہ اسے اللہ کی عبادت اور اس کی رضا کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو اس کی تمام سرگرمیاں ایک مرکز کے گرد گھومنے لگتی ہیں۔ مقصد کی یہ وضاحت اسے اخلاقی استقامت بخشتی ہے؛ وہ وقتی فائدے، لوگوں کی خوشنودی یا خواہشات کے دباؤ میں آ کر اپنے اصول تبدیل نہیں کرتا۔ سچائی پر ثابت قدم رہنا، مشکل حالات میں بھی انصاف کا دامن نہ چھوڑنا اور اپنوں و پرایوں کے ساتھ یکساں اچھا سلوک کرنا اسی استقامت کے مظاہر ہیں۔ اس کے مقابلے میں بے مقصد زندگی گزارنے والا شخص حالات کے رخ کے ساتھ بہتا رہتا ہے اور اس کے اخلاق میں کوئی پائیداری پیدا نہیں ہوتی۔

4۔ توحید کا عقیدہ اور انسانی مساوات و عزتِ نفس

یہ عقیدہ کہ تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، انسانوں کے درمیان مساوات اور باہمی احترام کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جب خالق ایک ہے تو کسی انسان کو رنگ، نسل، زبان یا دولت کی بنیاد پر دوسرے سے بڑا سمجھنا غلط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح توحید کا عقیدہ انسان کو مخلوق کی غلامی سے آزاد کر کے عزتِ نفس عطا کرتا ہے: جو شخص صرف اللہ کے آگے جھکتا ہے وہ کسی انسان کے آگے ذلت سے نہیں جھکتا، خوشامد، چاپلوسی اور ذاتی مفاد کے لیے دوسروں کے قدموں میں گرنے سے بچ جاتا ہے۔ یہ عزتِ نفس اخلاقی بلندی کی اہم شرط ہے، کیونکہ خوددار انسان ہی سچ بولنے اور حق پر ڈٹنے کی ہمت رکھتا ہے۔

5۔ صبر، شکر اور توازن جیسی صفات کی تربیت

تقدیر پر ایمان انسان کی اخلاقی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ مصیبت کے وقت یہ یقین کہ ہر حال اللہ کی تقدیر سے ہے اور وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، انسان کو مایوسی، بدزبانی اور انتقامی رویّے سے بچا کر صبر و تحمل سکھاتا ہے۔ آسائش کے وقت یہ یقین کہ نعمت اللہ کی عطا ہے، تکبر کے بجائے شکر گزاری اور عاجزی پیدا کرتا ہے۔ یوں صحیح عقیدہ انسان کی زندگی میں توازن برقرار رکھتا ہے: نہ وہ خوشحالی میں سرکش بنتا ہے اور نہ تنگی میں بداخلاق۔ اسی توازن کو اخلاقی پختگی کہا جاتا ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو ایک مومن کو دوسروں کے لیے آسانی اور رحمت کا باعث بناتی ہے۔

جدول 1: صحیح عقیدے کے اخلاقی ثمرات کا خلاصہ

عقیدے کا جز	قلبی کیفیت	اخلاقی نتیجہ
اللہ کی قدرت و نگرانی پر ایمان	خوف و خشیت اور احسان کا احساس	تنہائی میں بھی سچائی، امانت اور پرہیز گاری
آخرت اور حساب پر ایمان	ذمہ داری اور جوابدہی کا شعور	حقوق العباد کی ادائیگی، وعدہ وفائی، ظلم سے اجتناب
توحید پر ایمان	مساوات اور عزتِ نفس	غرور و نسل پرستی سے دوری، سب انسانوں کا احترام
تقدیر پر ایمان	صبر، شکر اور رضا	مصیبت میں تحمل، نعمت میں عاجزی اور توازن

غلط یا کمزور عقیدے کے اخلاقی نقصانات

جس طرح صحیح عقیدہ اخلاق کو سنوارتا ہے اسی طرح عقیدے کی خرابی اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے۔ شرک اور باطل عقائد انسان کو اندھی تقلید، توہم پرستی اور انسانوں کی غلامی میں مبتلا کر دیتے ہیں، نتیجتاً اس کی خودداری اور سچائی ختم ہو جاتی ہے۔ آخرت سے غفلت انسان کو مادہ پرستی کی دوڑ میں لگا دیتی ہے، جہاں نفع ہی واحد معیار بن جاتا ہے اور حلال و حرام کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ کمزور عقیدے والا شخص عبادت کو بوجھ سمجھتا ہے، اس کے قول و فعل میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں کے سامنے کچھ اور تنہائی میں کچھ اور ہوتا

ہے، جسے اخلاقی منافقت کہا جاتا ہے۔ تاریخ بھی گواہ ہے کہ جب جب قوموں کے عقائد بگڑے، ان کا اخلاقی زوال بھی ساتھ ساتھ ہوا؛ اور جب عقیدے کی اصلاح ہوئی تو معاشرے کی اخلاقی حالت بھی سنور گئی۔ اس لیے اصلاحِ اخلاق کی ہر کوشش کو عقیدے کی اصلاح سے شروع کرنا ضروری ہے۔

نتیجہ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عقیدہ لغت میں دل میں مضبوط گرہ کی طرح جمے ہوئے پختہ یقین کو اور اصطلاح میں اللہ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، یومِ آخرت اور تقدیر پر دل کی تصدیق کے ساتھ ایمان لانے کو کہتے ہیں۔ یہی عقیدہ انسانی اخلاق کی جڑ ہے: اللہ کی نگرانی کا احساس، آخرت کے حساب کا یقین، زندگی کے مقصد کی وضاحت، انسانی مساوات کا شعور اور صبر و شکر کی تربیت، یہ سب صحیح عقیدے ہی کے ثمرات ہیں۔ لہٰذا جو شخص یا معاشرہ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے اپنے عقیدے کو قرآن و سنت کی روشنی میں درست اور پختہ کرنا چاہیے، کیونکہ جڑ کی درستی کے بغیر شاخوں کی درستی دیرپا نہیں ہوتی۔

سوال نمبر 2: عقیدہ توحید کا مفہوم بیان کریں اور قرآن کی روشنی میں ثابت کریں کہ یہ تمام انبیاء کی دعوت کا نقطہ آغاز رہا ہے۔ (نمبر: 20)

تمہید

اسلام کی پوری عمارت جس بنیاد پر قائم ہے اسے توحید کہتے ہیں۔ توحید ہی وہ پہلا سبق ہے جو ہر نبی نے اپنی قوم کو دیا اور یہی وہ مرکزی پیغام ہے جس کے گرد پورا قرآن مجید گھومتا ہے۔ اس جواب میں پہلے عقیدۂ توحید کا مفہوم واضح کیا جائے گا، پھر قرآن مجید کی روشنی میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین ﷺ تک تمام انبیاء کی دعوت کا نقطۂ آغاز اور مرکز یہی توحید رہی ہے، اور آخر میں توحید کے انسانی زندگی پر اثرات کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اس جواب میں قرآنی مضامین مفہوم کی صورت میں حوالے کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں؛ آیات کے اصل عربی متن اور ترجمے کے لیے مستند قرآن مجید سے رجوع کرنا چاہیے۔

عقیدۂ توحید کا مفہوم

توحید کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو ایک قرار دینا اور یکتا ماننا۔ اصطلاح میں توحید سے مراد یہ پختہ عقیدہ رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ایک ہے، اس کی صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں، کائنات کی تخلیق، تدبیر اور حکمرانی میں وہ اکیلا ہے اور عبادت و بندگی کا حقدار صرف وہی ہے؛ نہ اس کا کوئی ہمسر ہے، نہ اولاد، نہ مددگار۔ اس عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق، مالک، رازق اور حاکم صرف اللہ ہے اور عبادت، دعا، نذر و نیاز اور اطاعت کی تمام صورتیں اسی کے لیے خاص ہیں۔ توحید کے مقابل شرک ہے، یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو اس کی ذات، صفات یا عبادت میں شریک ٹھہرانا، جسے قرآن مجید نے سب سے بڑا ظلم قرار دینے کا مفہوم دیا ہے (سورۃ لقمان، آیت 13 کا مفہوم)۔

توحید کی بنیادی اقسام

علماء نے فہم کی آسانی کے لیے توحید کو تین پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ پہلی توحیدِ ربوبیت ہے، یعنی یہ ماننا کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اسے چلانے والا، روزی دینے والا اور زندگی و موت دینے والا صرف اللہ ہے۔ دوسری توحیدِ الوہیت یا توحیدِ عبادت ہے، یعنی عبادت کی تمام اقسام صرف اللہ کے لیے خاص کرنا، جیسے نماز، دعا، قربانی اور توکل صرف اسی سے وابستہ ہوں۔ تیسری توحیدِ اسماء و صفات ہے، یعنی اللہ کے ان ناموں اور صفات کو اسی طرح ماننا جس طرح قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں، بغیر کسی تشبیہ یا انکار کے۔ ان تینوں پہلوؤں میں سے دعوتِ انبیاء کا سب سے زیادہ زور توحیدِ عبادت پر رہا ہے، کیونکہ اکثر قومیں اللہ کو خالق تو مانتی تھیں مگر عبادت میں دوسروں کو شریک کر دیتی تھیں۔

قرآن کی روشنی میں: تمام انبیاء کی دعوت کا آغاز توحید سے

1۔ ہر امت کی طرف رسول اور سب کا ایک ہی اعلان

قرآن مجید نے ایک عام اصول کے طور پر بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں رسول بھیجا اور اس کا پیغام یہ تھا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور طاغوت (ہر باطل معبود) سے بچو (سورۃ النحل، آیت 36 کا مفہوم)۔ یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم یا زمانے کے لیے دعوت کا آغاز جدا نہیں تھا؛ ہر رسول کی دعوت کی پہلی آواز توحید ہی تھی۔

اسی طرح قرآن میں یہ مفہوم بھی آیا ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا گیا جس کی طرف یہ وحی نہ کی گئی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کی عبادت کرو (سورۃ الانبیاء، آیت 25 کا مفہوم)۔ یہ دونوں مضامین ثابت کرتے ہیں کہ توحید محض ایک نبی کا پیغام نہیں بلکہ پوری نبوتوں کا مشترک اور ابتدائی پیغام ہے۔

2۔ حضرت نوح، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کی دعوت

قرآن مجید نے پچھلے انبیاء کی دعوت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بار بار ایک ہی جملے کا مفہوم دہرایا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (سورۃ الاعراف اور سورۃ المؤمنون میں مذکور مفہوم)۔ قومِ عاد کی طرف بھیجے گئے حضرت ہود علیہ السلام، قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے حضرت صالح علیہ السلام اور مدین کی طرف بھیجے گئے حضرت شعیب علیہ السلام، سب کی دعوت کا پہلا نکتہ یہی تھا کہ اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں (سورۃ الاعراف، آیات 65، 73 اور 85 کے مضامین کا مفہوم)۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں ناپ تول میں کمی جیسی معاشرتی برائی کی اصلاح بھی توحید کے اعلان کے بعد شروع کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء پہلے عقیدہ درست کرتے تھے، پھر اس کی بنیاد پر معاشرہ سنوارتے تھے۔

3۔ حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہما السلام کی دعوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرآن نے توحید کا سب سے نمایاں داعی بنا کر پیش کیا ہے۔ آپ نے بت پرستی کے ماحول میں اکیلے کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ میرا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں (سورۃ الانعام کے مضامین کا مفہوم)۔ آپ کی پوری زندگی اسی توحید کی تبلیغ اور اس کے لیے قربانیوں میں گزری، اسی لیے قرآن نے آپ کو حنیف یعنی یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونے والا قرار دیا۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں بھی سب سے پہلے توحید ہی کی دعوت دی اور اپنے ساتھیوں سے سوال کیا کہ الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے (سورۃ یوسف، آیت 39 کا مفہوم)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء مشکل ترین حالات میں بھی اپنی دعوت کا آغاز توحید ہی سے کرتے تھے۔

4۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور خاتم النبیین ﷺ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف بھیجا تو پیغام کی بنیاد بھی اللہ کی واحد حاکمیت کا اقرار تھی، اور بنی اسرائیل کو دی جانے والی شریعت کا پہلا اصول بھی یہی تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے (سورۃ آل عمران، آیت 51 اور سورۃ مریم کے مضامین کا مفہوم)۔ آخر میں حضور خاتم النبیین ﷺ کی بعثت ہوئی تو مکہ میں آپ کی دعوت کا پہلا اعلان بھی یہی تھا کہ لوگ ایک اللہ کی عبادت کریں اور بت پرستی چھوڑ دیں؛ قرآن کی سب سے جامع سورتوں میں سے سورۃ الاخلاص اسی توحید کا اعلان ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ ایک ہے، بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا، اور کوئی اس کے برابر نہیں۔ اس تسلسل سے واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی ﷺ تک ہر دعوت کا نقطۂ آغاز توحید ہی رہا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

جدول 1: انبیاء کی دعوت کا مشترک نقطۂ آغاز

دعوت کا پہلا نکتہ (مفہوم)	قوم / موقع	نبی
اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں	قومِ نوح	حضرت نوح علیہ السلام
اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں	قومِ عاد	حضرت ہود علیہ السلام
اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں	قومِ ثمود	حضرت صالح علیہ السلام
توحید کا اعلان، پھر ناپ تول کی اصلاح	اہلِ مدین	حضرت شعیب علیہ السلام
اکیلا غالب اللہ بہتر، یا الگ الگ رب؟	قید خانے کے ساتھی	حضرت یوسف علیہ السلام
اللہ میرا اور تمہارا رب ہے، اسی کی عبادت کرو	بنی اسرائیل	حضرت عیسیٰ علیہ السلام

ایک اللہ کی عبادت، بت پرستی کی تردید	اہلِ مکہ	حضور ﷺ

توحید کے انسانی زندگی پر اثرات

توحید صرف ایک ذہنی عقیدہ نہیں بلکہ پوری زندگی کو بدل دینے والا قوت ہے۔ یہ انسان کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خودداری عطا کرتی ہے، کیونکہ جو ایک خدا کا بندہ بن جاتا ہے وہ کسی انسان کا غلام نہیں رہتا۔ یہ عقیدہ بنی نوع انسان کی مساوات کا اعلان ہے کیونکہ سب کا رب ایک ہے اس لیے نسل و رنگ کی برتری ختم ہو جاتی ہے۔ توحید دل کو سکون دیتی ہے کہ نفع و نقصان کا مالک اللہ ہے، اس لیے انسان حرص، حسد اور مایوسی سے بچتا ہے۔ معاشرتی سطح پر توحید ایک امت کو ایک مرکز پر جمع کرتی ہے، جس سے اتحاد پیدا ہوتا ہے اور فرقہ واریت کی جڑیں کٹتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اپنی دعوت کا آغاز اسی سے کیا؛ جب توحید دل میں پختہ ہو جائے تو عبادات، اخلاق اور معاملات خود بخود سنورنے لگتے ہیں۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ توحید کا مفہوم اللہ کو اس کی ذات، صفات، افعال اور عبادت میں یکتا ماننا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات کے مضامین سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر امت میں آنے والے رسول کی دعوت کا پہلا اور مرکزی نکتہ یہی توحید تھا، چاہے وہ حضرت نوح ہوں یا حضرت ابراہیم، حضرت یوسف ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہم السلام، اور اسی سلسلے کی آخری کڑی حضور ﷺ ہیں۔ پس توحید کو تمام انبیاء کی دعوت کا نقطۂ آغاز کہنا قرآن کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔

سوال نمبر3: رسالت کا مفہوم بیان کریں اور انسانیت کی ہدایت کے لیے انبیاء کی ضرورت پر بحث کریں۔(نمبر: 20)

تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اسے یوں ہی بے راہ نہیں چھوڑا بلکہ اس کی ہدایت کا باقاعدہ انتظام فرمایا، اور اس انتظام کا نام رسالت ہے۔ انسان اپنی عقل سے بہت کچھ سمجھ سکتا ہے، مگر زندگی کے مقصد، موت کے بعد کی زندگی اور اللہ کی رضا کے راستوں جیسے بنیادی سوالات کے جواب کے لیے اسے آسمانی رہنمائی کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے۔ اس جواب میں پہلے رسالت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان کیا جائے گا، پھر دلائل کے ساتھ بحث پیش کی جائے گی کہ انسانیت کی ہدایت کے لیے انبیاء کی بعثت کیوں ضروری تھی اور رسالت کے انسانیت پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

رسالت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

رسالت عربی لفظ "اِرسال" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بھیجنا، پیغام دے کر روانہ کرنا۔ جو شخص کسی کا پیغام لے کر جائے اسے رسول یعنی پیغام بر کہتے ہیں اور پیغام پہنچانے کے منصب کو رسالت کہا جاتا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں رسالت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی برگزیدہ انسان کو منتخب فرما کر اس پر وحی نازل فرمائے اور اسے یہ ذمہ داری سونپے کہ وہ اللہ کا پیغام، اس کے احکام اور اس کی ہدایت دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور خود اس پر عمل کر کے عملی نمونہ پیش کرے۔ اسی منصب کے حامل کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس مفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ خود بہتر جانتا ہے کہ اس نے رسالت کا منصب کہاں اور کسے عطا کرنا ہے (سورۃ الانعام، آیت 124 کا مفہوم)۔ اس تعریف سے معلوم ہوا کہ رسالت انسان کی اپنی کوشش سے حاصل ہونے والی چیز نہیں بلکہ اللہ کا خالص انتخاب اور عطا ہے۔

انبیاء کی ضرورت: دلائل و بحث

1۔ انسانی عقل کی حدود

انبیاء کی ضرورت کا سب سے پہلا سبب انسانی عقل کی محدودیت ہے۔ عقل سے انسان مادی دنیا کے بہت سے راز معلوم کر سکتا ہے، لیکن غیب کی دنیا، موت کے بعد کے حالات، اللہ کی ذات و صفات کی تفصیل اور نجات کے یقینی راستے تک عقل کی رسائی نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ عقل ہر انسان کی ایک جیسی نہیں ہوتی؛ خواہشات، ماحول اور تعصب اسے گمراہ بھی کر دیتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہاں آسمانی ہدایت نہیں پہنچی وہاں کی عقلمند قومیں بھی بت پرستی، توہمات اور ظالمانہ رسوم میں مبتلا ہو گئیں۔ اس لیے رحمتِ الٰہی کا تقاضا ہوا کہ ایسی یقینی ہدایت بھیجی جائے جو عقل کی راہنمائی بھی کرے اور اس کی کوتاہیوں کی تلافی بھی کرے۔ قرآن میں اسی لیے رسولوں کو مبشر و نذیر یعنی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا کہہ کر بھیجنے کا مفہوم بیان ہوا ہے تاکہ انسانوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے (سورۃ النساء، آیت 165 کا مفہوم)۔

2۔ زندگی کے مقصد اور انجام کی خبر

انسان کے ذہن میں ازل سے یہ سوالات اٹھتے رہے ہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں، کیوں آیا ہوں اور مرنے کے بعد کہاں جاؤں گا۔ فلسفیوں نے ان سوالات کے اپنے اپنے جواب گھڑے مگر ان میں ہمیشہ اختلاف رہا اور کوئی یقینی جواب نہ مل سکا۔ انبیاء نے وحی کی بنیاد پر ان سوالات کے قطعی جوابات دیے: انسان اللہ کی مخلوق ہے، اسے اللہ کی عبادت اور زمین پر اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اور موت کے بعد اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ مقصد کی یہ وضاحت انسان کی زندگی کو بے راہ روی سے بچا کر ایک سمت عطا کرتی ہے، اور یہی وہ خدمت ہے جو انبیاء کے بغیر ممکن نہ تھی۔

3۔ عملی نمونہ کی ضرورت

محض کتابی ہدایت کافی نہیں ہوتی؛ انسان کو ایک ایسی زندہ شخصیت درکار ہوتی ہے جو ان احکام پر عمل کر کے دکھائے۔ انبیاء کی زندگیاں اسی عملی نمونے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ صبر کیسے کیا جاتا ہے، مشکل میں اللہ پر توکل کیسا ہوتا ہے، دشمن کے ساتھ انصاف اور کمزور کے ساتھ رحم کیسا ہوتا ہے، یہ سب انبیاء کی سیرت سے سیکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید

میں حضور ﷺ کی زندگی کو مؤمنوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دینے کا مفہوم اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے (سورۃ الاحزاب، آیت 21 کا مفہوم)۔ اگر انبیاء نہ آتے تو اللہ کے احکام کاغذ کی ہدایات بن کر رہ جاتے اور انسان یہ عذر پیش کر سکتا تھا کہ ان پر عمل انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ انبیاء نے عمل کر کے یہ عذر بھی ختم کر دیا۔

4۔ اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی ضرورت

ہر دور میں انسانی معاشرے ظلم، ناانصافی، سود، جوا، شراب، بدکاری اور کمزوروں کے استحصال جیسی برائیوں میں مبتلا رہے ہیں۔ ان برائیوں کو ختم کرنے کے لیے محض قانون کافی نہیں ہوتا، کیونکہ قانون کا نفاذ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب دلوں میں تبدیلی آئے۔ انبیاء نے دل کی دنیا بدلنے کا کام کیا؛ انہوں نے اللہ کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کا شعور پیدا کر کے معاشرے کو اندر سے سنوارا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ناپ تول کی بدعنوانی ختم کی، حضرت لوط علیہ السلام نے اخلاقی بے راہ روی کے خلاف آواز اٹھائی اور حضور ﷺ نے جاہلیت کے ظالمانہ رسوم ختم کر کے عورتوں، غلاموں اور یتیموں کے حقوق بحال کیے۔ یہ سب اسی لیے ممکن ہوا کہ پیغام لانے والا اللہ کا منتخب کردہ، معصوم اور قابلِ اعتماد انسان تھا۔

5۔ اختلافات کا فیصلہ اور عدل کا قیام

انسانی معاشروں میں مذہبی و اخلاقی اختلافات ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہر گروہ اپنے خیال کو ہی حق سمجھتا رہا ہے۔ ان اختلافات کا غیر جانبدار اور یقینی فیصلہ صرف وحی ہی سے ممکن ہے۔ قرآن مجید میں اس مفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے نبیوں کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں (سورۃ البقرہ، آیت 213 کا مفہوم)۔ اسی طرح انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد زمین پر عدل و انصاف کا قیام بھی بیان ہوا ہے۔ گویا رسالت صرف فرد کی نجات کا ذریعہ نہیں بلکہ پورے معاشرتی نظام کی درستی کی بنیاد بھی ہے۔

جدول 1: انبیاء کی ضرورت کے اسباب کا خلاصہ

انبیاء کا کردار	انسانی کمی	سبب

وحی کے ذریعے یقینی خبر	عقل موت کے بعد کے حالات نہیں جان سکتی	غیب کی معلومات
تخلیق کا مقصد اور انجام کی وضاحت	فلسفیانہ جوابات میں اختلاف	مقصدِ زندگی
اپنی سیرت سے نمونہ پیش کرنا	احکام پر عمل کی زندہ مثال نہیں ملتی	عملی نمونہ
ایمان و اخلاق سے اندرونی تبدیلی	قانون دلوں کو نہیں بدل سکتا	معاشرتی اصلاح
وحی کی بنیاد پر فیصلہ اور انصاف کا قیام	ہر گروہ خود کو حق پر سمجھتا ہے	اختلاف و عدل

رسالت کے سلسلے کا اختتام اور اس کا تقاضا

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کا یہ سلسلہ حضور خاتم النبیین ﷺ پر مکمل ہو گیا اور قیامت تک کے لیے قرآن مجید اور آپ ﷺ کی سنت ہی ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج انسانیت کی ہدایت کا پورا انتظام موجود اور محفوظ ہے؛ ضرورت صرف اس سے رجوع کرنے کی ہے۔ اسی طرح یہ بھی یاد رہے کہ انفرادی عملی مسائل میں اہلِ علم اور مستند علماء سے راہنمائی لینا ہی اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے کا درست طریقہ ہے۔ رسالت کا یہ تسلسل اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی دور کی انسانیت کو بھی ہدایت سے محروم نہیں رکھا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ رسالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب بندے کو وحی کے ذریعے انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے منصب کا نام ہے۔ انسانیت کو انبیاء کی ضرورت اس لیے تھی کہ عقل غیب تک نہیں پہنچ سکتی، زندگی کے مقصد کا یقینی جواب وحی ہی دے سکتی ہے، احکام کے لیے زندہ عملی نمونہ درکار ہوتا ہے، معاشرتی برائیوں کا علاج دلوں کی تبدیلی سے ہوتا ہے اور اختلافات کا فیصلہ و عدل کا قیام وحی ہی کی روشنی میں ممکن ہے۔ یوں رسالت اللہ کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ہے جس کے ذریعے انسان کو دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ ملا۔

سوال نمبر4: نبی اور رسول کے درمیان علمی فرق واضح کریں اور منصب رسالت کی خصوصیات لکھیں۔(نمبر: 20)

تمہید

اسلامی عقائد میں نبوت و رسالت کا موضوع بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عام گفتگو میں نبی اور رسول کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اہلِ علم نے ان دونوں مناصب کے درمیان باریک علمی فرق بھی بیان کیا ہے۔ اس جواب میں پہلے نبی اور رسول کی تعریفیں اور ان کے درمیان مشہور علمی فرق کو مختلف آراء سمیت پیش کیا جائے گا، پھر منصبِ رسالت کی نمایاں خصوصیات تفصیل سے لکھی جائیں گی، تاکہ طالب علم ان دونوں پہلوؤں کو واضح طور پر سمجھ سکے۔

نبی کی تعریف

لفظ نبی "نبأ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں خبر، خصوصاً اہم اور عظیم خبر۔ بعض علماء کے نزدیک یہ "نبوت" یعنی بلندی سے لیا گیا ہے، کیونکہ نبی کا مقام عام انسانوں سے بلند ہوتا ہے۔ اصطلاح میں نبی اس برگزیدہ انسان کو کہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ وحی نازل فرمائے، خواہ اسے نئی شریعت دی گئی ہو یا پچھلی شریعت کی تجدید و تائید کی ذمہ داری سونپی گئی ہو، اور اسے کسی خاص قوم کی طرف تبلیغ کے لیے مبعوث کیا گیا ہو یا اپنے لیے وحی کو خاص رکھا گیا ہو، اس تفصیل میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ البتہ متفقہ بات یہ ہے کہ نبی اللہ کا منتخب، سچا اور معصوم بندہ ہوتا ہے جسے غیب کی خبریں وحی کے ذریعے عطا کی جاتی ہیں۔

رسول کی تعریف

لفظ رسول "اِرسال" سے ہے جس کے معنی ہیں پیغام دے کر بھیجنا۔ اصطلاح میں رسول اس نبی کو کہا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نئی شریعت یا کتاب عطا فرما کر کسی قوم کی طرف باقاعدہ مبعوث فرمایا ہو اور اسے تبلیغ و دعوت کا حکم دیا گیا ہو۔ یعنی رسول کے ساتھ دو اضافی باتیں پائی جاتی ہیں: ایک شریعت و پیغام کی ذمہ داری اور دوسری امت کی طرف بھیجے جانے کی صراحت۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر رسول کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے کہ اللہ نے انہیں قوموں کی ہدایت کے لیے بھیجا اور انہوں نے اللہ کا پیغام پہنچایا۔

اس تعریف کی روشنی میں مشہور قول یہ ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا، اور رسولوں کی تعداد نبیوں کی نسبت کم اور ان کا منصب بظاہر زیادہ وسیع ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے۔

نبی اور رسول کے درمیان علمی فرق

پہلی رائے: نئی شریعت کا فرق

علماء کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک اصل فرق نئی شریعت کا ہے۔ جس برگزیدہ ہستی کو نئی شریعت یا نئی کتاب دے کر بھیجا گیا وہ رسول ہے، اور جسے پہلے رسول کی شریعت پر عمل و تبلیغ کا کام سونپا گیا وہ نبی ہے۔ اس رائے کے مطابق مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول ہیں کیونکہ آپ کو تورات کی شریعت عطا ہوئی، جبکہ آپ کے بعد بنی اسرائیل میں آنے والے کئی انبیاء اسی شریعت کے تابع رہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں کیونکہ آپ کو انجیل عطا ہوئی اور حضور ﷺ رسول ہیں کیونکہ آپ کو قرآن اور مکمل شریعت عطا ہوئی۔

دوسری رائے: تبلیغ کی عمومی ذمہ داری کا فرق

دوسری رائے یہ ہے کہ فرق تبلیغ کی نوعیت کا ہے: رسول وہ ہے جسے کسی قوم کی طرف بھیج کر علانیہ تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو، جبکہ نبی کے بارے میں بعض صورتوں میں یہ ذمہ داری اس مخصوص انداز میں نہ بھی ہو۔ اس رائے کو ماننے والے کہتے ہیں کہ ہر رسول کو اپنی قوم سے براہِ راست مخاطب ہونے اور پیغام پہنچانے کا حکم ملا، اسی لیے قرآن میں رسولوں کی قوموں کے ساتھ تکرار اور ان کی طرف سے تصدیق و تکذیب کا سلسلہ تفصیل سے مذکور ہے۔ یہ رائے پہلی رائے سے متصادم نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، کیونکہ نئی شریعت لانے والا لازمی طور پر تبلیغ کا مکلف بھی ہوتا ہے۔

تیسری صورت: دونوں اصطلاحات کا باہمی استعمال

یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن و سنت میں نبی اور رسول کے الفاظ بعض جگہ ایک ہی ہستی کے لیے دونوں استعمال ہوئے ہیں۔ خود حضور ﷺ کو قرآن میں نبی بھی کہا گیا اور رسول بھی، مثلاً بعض آیات میں "اے نبی" کہہ کر خطاب ہوا اور بعض میں آپ کی رسالت کا اعلان ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق منصب کی حقیقت میں کوئی تضاد پیدا نہیں کرتا بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ نبوت وحی کے حصول کا پہلو ہے اور رسالت اس وحی کو انسانوں تک پہنچانے کا پہلو۔ لہٰذا علمی فرق بیان کرنا علمی دقت نظری کے لیے ہے، ایمان کے اعتبار سے تمام انبیاء و رسل پر یکساں ایمان لانا فرض ہے اور ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس نازک علمی بحث میں حتمی جزئیات کے لیے مستند کتبِ عقائد اور اہلِ علم سے رجوع کرنا مناسب ہے۔

جدول 1: نبی اور رسول کا موازنہ

پہلو	نبی	رسول
لغوی ماخذ	نبأ: اہم خبر	ارسال: پیغام دے کر بھیجنا
وحی	وحی نازل ہوتی ہے	وحی نازل ہوتی ہے
نئی شریعت	مشہور رائے کے مطابق ضروری نہیں؛ پچھلی شریعت کا تابع ہو سکتا ہے	نئی شریعت یا کتاب عطا کی جاتی ہے
تبلیغ کی ذمہ داری	حسبِ حکم	قوم کی طرف باقاعدہ مبعوث اور تبلیغ کا مکلف
باہمی نسبت	ہر رسول نبی ہے	ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں

منصبِ رسالت کی خصوصیات

1۔ الٰہی انتخاب اور اصطفاء

رسالت کسی انسان کی محنت، ریاضت یا خواہش سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ خالص اللہ کا انتخاب ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لیے چن لیتا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ رسالت کا اہل کون ہے۔ اسی لیے رسولوں میں بادشاہ بھی ہوئے اور عام پیشوں سے وابستہ بزرگ بھی؛ معیار نسب، دولت یا دنیاوی مرتبہ نہیں بلکہ اللہ کا چناؤ ہے۔ یہ خصوصیت رسول کی بات کو انسانی کلام سے ممتاز کرتی ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ذاتی دعوے پر نہیں بلکہ الٰہی اصطفاء پر ہوتی ہے۔

2۔ وحی کا نزول

منصبِ رسالت کی نمایاں ترین خصوصیت وحی ہے۔ وحی کے ذریعے رسول کو وہ علم ملتا ہے جو انسانی عقل و حواس سے حاصل نہیں ہو سکتا، جیسے غیب کی خبریں، اگلی زندگی کے حالات اور اللہ کے احکام۔ وحی کبھی فرشتے کے ذریعے آتی، کبھی براہِ راست کلام کی صورت میں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے، اور کبھی دل میں القا کی صورت میں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ پر وحی کا سلسلہ مکمل اور ختم ہو چکا ہے، اور قرآن مجید اس وحی کا محفوظ مجموعہ ہے۔

3۔ عصمت یعنی گناہ سے حفاظت

اہلِ سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء و رسل اللہ کی حفاظت کے تحت کبیرہ گناہوں اور تبلیغی امور میں خطا سے محفوظ ہوتے ہیں، اسے عصمت کہا جاتا ہے۔ یہ حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ اگر پیغام پہنچانے والا خود گناہوں میں مبتلا ہو تو لوگ اس کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے اور اللہ کی حجت قائم نہیں ہو سکے گی۔ عصمت کا مطلب یہ بھی ہے کہ رسول دین کی تبلیغ میں جان بوجھ کر کوئی کمی بیشی نہیں کرتا؛ جو کچھ اسے پہنچانے کا حکم ملتا ہے وہی بغیر کسی کمی بیشی کے، مکمل اور درست طور پر، امت تک پہنچا دیتا ہے۔

4۔ معجزات و صداقت کی نشانیاں

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی صداقت کی نشانی کے طور پر انہیں معجزات عطا فرماتا ہے، یعنی ایسے خارقِ عادت کام جو عام انسانوں کے بس سے باہر ہوں اور جو ان کے دعوے کی تصدیق کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا اور بیماروں کا شفایاب ہونا (اللہ کے اذن سے) اور حضور ﷺ کا سب سے بڑا اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ قرآن مجید اس کی نمایاں مثالیں ہیں، جن کا بیان مفہوماً قرآن میں موجود ہے۔ معجزہ رسول کی دلیل ہوتا ہے تاکہ قوم کے لیے ایمان لانے میں کوئی ابہام نہ رہے۔

5۔ فطانت، امانت اور شجاعت جیسے اوصاف

رسولوں میں وہ تمام اخلاقی و ذہنی اوصاف کمال درجے میں پائے جاتے ہیں جو ان کے منصب کے لیے ضروری ہیں: سچائی تاکہ ان کی ہر خبر قابلِ اعتماد ہو، امانت تاکہ وحی میں ذرہ برابر تبدیلی نہ ہو، تبلیغ کی مکمل ذمہ داری تاکہ پیغام ہر فرد تک پہنچے، اور اعلیٰ درجے کی ذہانت و سمجھ بوجھ تاکہ وہ ہر قسم کے سوالات و اعتراضات کا حکمت سے جواب دے سکیں۔ اس کے ساتھ رسول مشکلات میں ثابت قدم، بہادر اور حلیم الطبع بھی ہوتے ہیں۔ یہ اوصاف ذاتی کمالات ہونے کے ساتھ ساتھ امت کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بھی ہیں۔

6۔ بشریت اور عملی نمونہ ہونا

رسالت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ رسول انسانوں ہی میں سے ہوتا ہے، فرشتہ یا کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں۔ قرآن میں اس مفہوم کی تصریح ہے کہ رسول بشر ہیں جن کی طرف وحی آتی ہے (سورۃ الکہف، آیت 110 کا مفہوم)۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان ہی انسان کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بن سکتا ہے؛ وہ کھاتا پیتا، خاندان رکھتا، خوشی و غم سے گزرتا اور پھر بھی اللہ کے احکام پر کامل عمل کر کے دکھاتا ہے۔ اگر رسول فرشتہ ہوتا تو انسان کہہ سکتا تھا کہ یہ عمل ہمارے بس کی بات نہیں۔ رسول کی بشریت انسانوں پر اللہ کی حجت کو مکمل کر دیتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نبی اور رسول دونوں اللہ کے برگزیدہ اور معصوم بندے ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ مشہور علمی فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول کو نئی شریعت و کتاب کے ساتھ قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے جبکہ نبی پچھلی شریعت کا متبع بھی ہو سکتا ہے؛ اس لیے ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں۔ منصبِ رسالت کی خصوصیات میں الٰہی انتخاب، وحی، عصمت، معجزات، سچائی و امانت و فطانت جیسے کمالات اور انسانوں میں سے ہونا شامل ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمام انبیاء و رسل پر بلا تفریق ایمان لایا جائے۔

سوال نمبر 5: مشہور چار فرشتوں کے نام اور ان کے کائناتی و انسانی فرائض پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ (نمبر: 20)

تمہید

فرشتوں پر ایمان ایمان کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہیں جو اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کام کی ذمہ داری انہیں سونپی جاتی ہے اسے پوری امانت سے انجام دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں کئی فرشتوں کا ذکر آیا ہے، مگر چار فرشتے اپنے بڑے اور نمایاں فرائض کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور ہیں: حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل یعنی ملک الموت علیہم السلام۔ اس نوٹ میں ان چاروں کے نام، ان کے کائناتی نظام سے متعلق فرائض اور انسانوں کی زندگی سے متعلق ان کے کردار کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ فرشتوں کی جزئی تفصیلات میں نصوص میں جو کچھ آیا ہے اسی پر ایمان رکھنا چاہیے؛ غیر مستند باتوں سے بچنا ضروری ہے۔

فرشتوں کا مختصر تعارف

علماء کے بیان کے مطابق فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں، وہ کھاتے پیتے نہیں، مرد و عورت کی تقسیم ان میں نہیں ہوتی اور وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کی قدرت ہی نہیں رکھتے؛ قرآن مجید میں ان کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں (سورۃ التحریم، آیت 6 کا مفہوم)۔ ان کی تعداد اللہ ہی

کو معلوم ہے اور ان کے فرائض بھی گوناگوں ہیں: کچھ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، کچھ وحی لاتے ہیں، کچھ بارش و رزق کا انتظام سرانجام دیتے ہیں، کچھ انسان کے اعمال لکھتے ہیں اور کچھ اس کی حفاظت پر مامور ہیں۔ چار مشہور فرشتے ان تمام فرائض میں سب سے بڑی ذمہ داریاں رکھتے ہیں، اسی لیے انہیں فرشتوں کے سردار بھی کہا جاتا ہے۔

1۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام

فرائض کی تفصیل

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو تمام فرشتوں میں سب سے عظیم مقام حاصل ہے۔ ان کا سب سے بڑا فرض انبیاء کی طرف اللہ کی وحی پہنچانا ہے؛ قرآن مجید میں آپ کو روح الامین یعنی امانت دار روح کہہ کر آپ کے ذریعے قرآن کے نزول کا مفہوم بیان ہوا ہے (سورۃ الشعراء، آیات 193 تا 195 کا مفہوم) اور آپ کو روح القدس بھی کہا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین ﷺ تک ہر نبی کے پاس وحی لے کر یہی فرشتہ آتا رہا، اور حضرت محمد ﷺ پر تیئیس برس کے عرصے میں قرآن مجید بتدریج آپ ہی کے ذریعے نازل ہوا۔ وحی کے علاوہ اللہ کے حکم سے بعض اہم موقعوں پر انبیاء و مؤمنین کی مدد کا کام بھی آپ سے منسوب ہے، جیسا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر فرشتوں کی مدد کا وعدہ قرآن میں مذکور ہے (سورۃ آل عمران و سورۃ الانفال کے مضامین کا مفہوم)۔ کائناتی اعتبار سے آپ وحی و ہدایت کے نظام کے امین ہیں اور انسانی اعتبار سے آپ کا فرض انسانیت کے لیے حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ بننا ہے، کیونکہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت ہی انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضامن ہے۔ حضور ﷺ پر وحی مکمل ہونے کے بعد اب کوئی نئی وحی نہیں آئے گی؛ اس لیے اب جبرائیل علیہ السلام کے اس فرض کا سلسلہ اختتام کو پہنچ چکا ہے اور قرآن کی صورت میں وہ ہدایت قیامت تک محفوظ ہے۔

2۔ حضرت میکائیل علیہ السلام

فرائض کی تفصیل

حضرت میکائیل علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں حضرت جبرائیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے (سورۃ البقرہ، آیت 98 کا مفہوم)۔ آپ کا بڑا فرض کائنات میں بارش برسانے اور مخلوق کے رزق کی تقسیم و انتظام کا نظام چلانا ہے، یعنی اللہ کے حکم کے تابع ہو کر ہوائیں، بادل اور بارش کا انتظام اور زمین کی روئیدگی و مخلوقات کی روزی سے متعلق ذمہ داریاں آپ کے سپرد ہیں۔ انسانی زندگی اس فرض سے براہِ راست جڑی ہوئی ہے، کیونکہ انسان کی خوراک، فصلیں، پانی اور موسم سب اسی نظام سے وابستہ ہیں۔ اس سے انسانی ذہن میں یہ سبق بھی پیدا ہوتا ہے کہ رزق کی کنجیاں حقیقتاً اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور فرشتے اللہ کے مقرر کردہ نظام کے ماتحت کام کرتے ہیں، از خود خالق و مالک نہیں۔ اسی لیے مسلمان رزق کی دعا بھی اللہ ہی سے کرتا ہے اور فرشتوں کو اللہ کا فرمانبردار بندہ سمجھ کر ان کی عزت کرتا ہے، ان کی عبادت ہرگز نہیں کرتا۔

3۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام

فرائض کی تفصیل

حضرت اسرافیل علیہ السلام وہ عظیم فرشتے ہیں جن کے ذمے صور پھونکنے کی ذمہ داری ہے۔ احادیث کے مفہوم کے مطابق آپ صور کو منہ سے لگائے اللہ کے حکم کے منتظر ہیں۔ پہلی بار صور پھونکا جائے گا تو کائنات کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور تمام زندہ مخلوق پر موت طاری ہو جائے گی؛ یہ قیامت کی ابتدا ہو گی۔ دوسری بار صور پھونکے جانے پر تمام مردے اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر میدانِ حشر کی طرف اٹھ کھڑے ہوں گے، جہاں اعمال کا حساب ہو گا۔ قرآن مجید میں صور پھونکے جانے اور اس کے نتیجے میں لوگوں کے گروہ در گروہ آنے کا مفہوم بیان ہوا ہے (سورۃ الزمر اور سورۃ النبأ کے مضامین)۔ انسانی اعتبار سے اس فرشتے کا فرض انسان کو اس کے انجام سے خبردار رکھتا ہے: جو شخص اسرافیل علیہ السلام کے صور کو یاد رکھتا ہے اس کے لیے دنیا کی زندگی کھیل تماشا نہیں رہتی بلکہ وہ ہر لمحہ آخرت کی تیاری کی فکر میں رہتا ہے۔

4۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام (ملک الموت)

فرائض کی تفصیل

چوتھے مشہور فرشتے وہ ہیں جنہیں قرآن مجید میں ملک الموت یعنی موت کا فرشتہ کہا گیا ہے اور عوام میں حضرت عزرائیل کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا فرض اللہ کے مقرر کردہ وقت پر ہر جاندار کی روح قبض کرنا ہے۔ قرآن کے مفہوم کے مطابق ملک الموت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے وہی تمہاری روح قبض کرتا ہے اور پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے (سورۃ السجدہ، آیت 11 کا مفہوم)۔ ہر انسان کی موت کا وقت اور جگہ اللہ کے علم میں مقرر ہے؛ نہ کوئی اس سے آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے رہ سکتا ہے۔ بعض روایات کے مفہوم میں یہ بھی آیا ہے کہ ملک الموت کے مددگار فرشتے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے حکم کے تحت روح قبض کرنے کے کام میں معاون ہوتے ہیں۔ انسانی اعتبار سے اس فرشتے کی یاد انسان کو غفلت سے بیدار کرتی ہے، ظلم و ناانصافی سے روکتی ہے اور نیکی کی طرف راغب کرتی ہے، کیونکہ جو شخص موت کو یقینی سمجھتا ہے وہ دنیا میں ہمیشہ رہنے کی حرص سے بچ جاتا ہے۔

جدول 1: چار مشہور فرشتے اور ان کے فرائض

فرشتہ	بڑا فرض	انسان سے تعلق
حضرت جبرائیل علیہ السلام	انبیاء کی طرف وحی پہنچانا	ہدایت و حق کی پہچان کا ذریعہ
حضرت میکائیل علیہ السلام	بارش اور رزق کے نظام کی نگرانی	خوراک، پانی اور روزی کا انتظام
حضرت اسرافیل علیہ السلام	صور پھونکنا	قیامت کا آغاز اور حشر کا برپا ہونا
ملک الموت (عزرائیل) علیہ السلام	روح قبض کرنا	ہر انسان کی موت اپنے مقرر وقت پر

فرشتوں پر ایمان کے عملی اثرات

ان فرشتوں پر ایمان محض ایک معلوماتی عقیدہ نہیں بلکہ اس کے عملی اثرات بھی ہیں۔ وحی پر ایمان انسان کو قرآن سے جوڑتا ہے؛ رزق کے نظام پر ایمان اسے توکل سکھاتا ہے اور حرص سے بچاتا ہے؛ صور اور موت کے فرشتے پر ایمان اسے آخرت کی تیاری کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اعمال لکھنے والے فرشتوں کا عقیدہ انسان کو ہر وقت محتاط رکھتا ہے۔ یوں فرشتوں کا عقیدہ مسلمان کی پوری زندگی کو ذمہ داری، نیکی اور تقویٰ کے راستے پر گامزن رکھنے والی قوت ہے۔ اسی لیے اس موضوع میں مستند کتب و علماء کی طرف رجوع کرنا اور لاعلمی میں کوئی بات فرشتوں کی طرف منسوب نہ کرنا عقیدے کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ چار مشہور فرشتے حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام ہیں۔ حضرت جبرائیل وحی کے امین، میکائیل بارش و رزق کے نظام کے نگران، اسرافیل صور پھونکنے پر مامور اور ملک الموت روح قبض کرنے پر مقرر ہیں۔ یہ سب فرشتے اللہ کے فرمانبردار بندے اور اس کے کائناتی نظام کے کارندے ہیں؛ ان پر ایمان لانا ایمان کا جز ہے اور ان کی یاد انسان کو ہدایت، توکل اور آخرت کی تیاری کی طرف لے جاتی ہے۔